

مسلسل ایک تو اتر جسے اترتے تھے اور اپنی مرگ ناک سلسلتی آہنی کر چیاں بکھیرتے ہوئے سوچ کا چوند کرتے جاتے تھے .. ہر شے کو ادھیرتے جاتے تھے .. درو بام کو تہہ والا کرتے، پانیوں میں ہلچل مچاتے یہ راکٹ پہلی سیر ہی پر کھڑا کوئی شخص یا کئی شخص فائز کر رہے تھے .. پانچویں راکٹ نے تہہ خانے کے دو شہمیروں میں جا چھید کیا اور چھپت پھاڑ کر اوپر نکل گئے .. اور جہاں شگاف ہوا، وہاں سے جانی کو پہلی بار آسمان کا ایک نکڑا نظر آیا جو نیلا اور زندگی سے دھڑکتا تھا اور جس لمحے اس نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا، اس پانچویں راکٹ کی کچھ کر چیاں اس کے بدن میں پروئی جا چکی تھی اور اسی لمحے آسمان کے اس نکڑے میں سے ایک پرنده تیر تاگز ر گیا ..

شگاف کے مقام سے تین سال خورde شہمیر پانی میں آگرے اور بڑبڑا نے لگے .. وہ پہلی بار تہہ خانے کو اس کی مکمل جزیات کے ساتھ دیکھ سکتے تھے کہ اس میں راکٹوں کی آگ شب برات کرتی تھی، انار چھوٹتے تھے، پھل جھڑیاں چلتی تھیں اور ہوانیاں بلند ہوتی تھیں ... ایک دیوالی تھی جس میں تہہ خانے کا یہ چھوٹا سا بنا رہا سینکڑوں چراغوں سے جھلما تا تھا ..

انہیں دھماکے تو سنائی ہی نہیں دے رہے تھے .. وہ صرف شب برات کی روشنیاں اپنے چہروں پر محسوس کرتے تھے اور دیوالی کے دینے ان کے بدنوں کو روشن کرتے تھے ..

انہوں نے پہلی بار اللہ بخش، عبد الوہاب اور ابو طالب کے مردہ چہرے دیکھے .. اور انہیں دیکھ کر آبدیدہ ہوئے۔ برف ہو چکے آنسوؤں میں کھو چکے یاروں کی دیدی نے حدت بھر دی .. بس اتنی ہی حدت جتنی کہ ایک آنسو کو بنہے کے لیے درکار ہوتی ہے .. اگرچہ وہ ان کے چہرے بارود بھرے دھوئیں کی چلن میں سے دیکھتے تھے .. خوب پرداہ ہے کہ چلن سے لگے بیٹھے ہیں .. اللہ بخش .. عبد الوہاب اور ابو طالب .. خوب پرداہ ہے ..

جو بھی راکٹ سیڑھیوں سے فائر ہو کر نیچے آتا، اس کا کوئی خاص ہدف نہ ہوتا۔ اگر وہ پانی کے اندر مار کرتا تو اس کی تہہ میں جو کچا فرش تھا، اسے ادھیر کر ایک گڑھا کھود کر ٹھنڈا ہو جاتا۔ اور اگر وہ سیڑھیوں سے نیچے آ کر بالکل سامنے جاتا، پانیوں پر سے گزر جاتا تو اس کے آگے مٹی کی ایک دبیز دیوار ہوتی جسے وہ کوئی ضعف نہ پہنچا سکتا اور اس کے ساتھ ٹکر اکر پانی میں گر جاتا۔ البتہ اس کے پھٹنے سے جو کرچیاں ایک گل رنگ انار کی مانند چھوٹیں اور بکھر تیں، وہ ان چاروں کے جسموں میں کہیں نہ کہیں پوسٹ ہو جاتیں۔

تہہ خانے کے پانی بارود کی آگ سے تلاطم میں تھے اور ان میں ایک خاص حدت جنم لے رہی تھی جو ان کے بدنوں کو راحت سے آشنا کر رہی تھی۔ اور ان پانیوں میں ان کی اپنی غلاظت، گھوڑے کی لید اور اس کے پر نیچے اور تین لاشوں کی بُوا تھل پھل ہو رہی تھی۔

وہ پانیوں کی اس تھل پھل میں ان مرغایبوں کی مانند حواس باختہ اور سنائے میں تھے جن پر کسی محفوظ اور پُرسکون جھیل میں تیرتے ہوئے ناگہانی فائر کھل جاتا ہے۔

اللہ بخش، عبد الوہاب اور ابو طالب ایک بے اختیار نڈھاں حالت میں اپنی اپنی لاشوں کو بھی سنبھال نہیں پاتے تھے اور کبھی وہ مکمل طور پر غرق ہو جاتے تھے اور کبھی ان سے جا ٹکراتے تھے تو انہیں بھی اپنی مانند سرد، مردہ اور اکٹے ہوئے پاتے تھے۔ گھوڑے کی تھوڑی تھیت میں بچکو لے کھاتی پھرتی تھی کہ یہ کیسا تلاطم ہے اور لاشوں سے امکنی تھی۔ کچھ پرانی تھیں اور کچھ نئی۔

یہ آگ تماشا چند لمحوں بعد ختم ہو گیا۔

جیسے پانی کھم گئے تھے۔

پانیوں میں حدت پیدا ہو چکی تھی اور ان کے اوپر دھواں معلق تھا اور اس

سے اوپر شگاف میں سے قلعہ جنگی کے آسمان کا ایک نکڑا نظر آ رہا تھا اور وہاں
دھوپ تھی ..

وہ بوٹ اب سیرھی سے ہٹ پکے تھے اور سایہ جا چکا تھا ..
دھوپ اب بھی پہلی سیرھی پر بر اجمن تھی .. لا تعلق اور روشن جیسے کچھ
ہوا ہی نہیں ..

چھت کے شگاف میں سے نظر آتے نیلے آسمان پر ایک اور پرندہ گزرا ..
یہ ایک اور نہیں وہی پرندہ تھا جو پہلے بھی گزرا تھا اور جانی کو دکھائی دیا
تھا ..

تہہ خانے میں دھماکوں کی بوچھاڑ اور شب برات اور دیوالی کی چکا چوند
کے بعد اتنی خاموشی ہوئی، اتنی تاریکی ہوئی کہ ناگوار لگنے لگی ..
پانی جو بھی ہلکی حدت میں تھے، دھیرے دھیرے سرد مہری کی جانب بہنے
لگے ..

دو پھر جو ڈھل پچکی تھی، شام کی سیاہی میں گھلنے لگی ..
چھت کے شگاف کے راستے پہلی بار شام آئی تو اس کی سرئی آنکھوں
نے دیکھا کہ تہہ خانے میں صرف ہاشم میر سلامت ہے ..
سلامت سے مراد یہ ہے کہ وہ مکمل حالت میں تھا اگرچہ مردہ تھا ...
مرتضی بیگ اور گل شیر ولی بکھر پکھے تھے ..

بیگ کے بدن کا کوئی ایک حصہ .. کوئی ایک ہاتھ یا چوڑا سینہ بھی باقی
نہیں بچا تھا .. وہ جیسے پانیوں میں تخلیل ہو چکا تھا ..

البتہ گل شیر نبٹا خوش نصیب رہا تھا کہ کم از کم اس کا سر سلامت تھا ..
دھڑ سے پچھڑا ہوا یہ سرپانیوں میں ڈیکیاں کھاتا پھرتا تھا .. دیر کے شیریں مالٹے کی
مانند .. کوئی دیکھ تو نہیں رہا تھا لیکن اگر کوئی دیکھتا تو گل شیر کا سر حیرت انگیز طور پر

بُدھا کے اس سر سے مشابہت رکھتا تھا جو قلعہ جنگلی کے ایک گڑھے میں پڑا تھا.. اس کے چہرے پر ایک الوہی سکون تھا.. گیان و دھیان کی شانستی تھی.. آنکھیں نروان کے نشے میں بند تھیں.. بال سر پر بندھے ہوئے تھے اور وہ دیر کے شیریں مالٹے کی مانند ادھر اور ڈیکیاں کھاتا پھرتا تھا.. گندھارا کی مٹی نے اسے موت کے بعد اپنے ماضی کی جانب دھکیل دیا تھا..

اور گھوڑے کی تھوڑتھی تھی جو پانیوں کی آخری ہاپچل میں ڈولتی جھولتی جانی کے بدن سے جاگتی تھی اور مردہ ہونے کے باوجود جان گئی تھی کہ اسے شوٹ کرنے کے باوجود اسے چاہنے والے کے بدن میں ابھی تک حرارت موجود ہے.. وہ سیکھا ہے اور زندہ ہے..

وہ پرندہ بھی اسی لیے لوٹ کر آیا تھا تاکہ نیچے قلعہ جنگلی کے صحن میں جو شگاف تھا، اس میں جھانک کر دیکھ سکے کہ جس نے اسے آسمان پر تیرتے دیکھا تھا، وہا بھی تک ہے یا نہیں.. اور وہ تھا..

پانی پھر سے سرد ہو چکے تھے..

بارود کی عطا کر دہ عارضی حرارت ان میں سے زائل ہو چکی تھی..
البتہ ان پانیوں پر اب ایک میلہ لگا ہوا تھا.. میلے میں خوب رونق تھی..
اللہ بخش، وہاب، ابو طالب اور ہاشم میر بڑے فخر اور اطمینان سے ان پر تیرتے تھے کہ ان کے وجود سلامت تھے اور روزِ حشر ان کو سمیئنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی.. مرغی بیگ پانیوں میں یوں گھل مل گیا تھا کہ اسے اس روز آخر اکٹھا کرنے میں یقیناً بہت سی دشواری ہوئی تھی اور ان میں گل شیر ولی کا سر ایک تمثیلی کی مانند کبھی اسے دیکھتا تھا اور کبھی اسے اور پھر کبھی ڈوبتا تھا اور کبھی پانی کی سطح پر ابھر آتا تھا.. اس کا باقیہ دھڑنہ بھی مجتمع کیا جا سکا تو کم از کم اس کا سر تو سلامت تھا..

گھوڑے کی تھوڑی بتہ جانی کے ساتھ لگ کر بچکوئے کھاتی بچکیاں لیتی تھی۔

رات ہو گئی تھی..

شام کے مریغی قدم پچھلے پاؤں لوٹ گئے تھے اور ان کی جگہ رات کا سیاہ پوش اپنا باداہ پھیلایتا تھا..

اوپر.. چھت کے شگاف میں سے قلعہ جنگلی کے آسمان کے ایک مختصر نکلے میں ستارے نائکے گئے تھے جو چاندنی کی بلکلی لو میں کم کم دکھائی دیتے تھے.. ان سب ستاروں کو گنا جا سکتا تھا... شگاف زیادہ بڑا نہیں تھا.. عبد الحمید جان واکر اس میلے کا واحد تماشائی تھا..

اس پر کئی روز کی بھوک... کہ اس نے اپنے پونی کو کھانے سے انکار کر دیا تھا اور پیاس بدن میں براجمان کر چیوں، ٹھہری ہوئی گولیوں .. زخموں .. ناسروں .. کا سحر طاری ہو چکا تھا.. اس کے چوڑے شانوں پر آئے ہوئے غلظی بال تیکھی سولوں کی مانند اکڑے ہوئے تھے... بے تجاشا بڑھی ہوئی داڑھی ناگوں میں لرزش آجائے سے کبھی پانی کو جا چھوٹی اور کبھی وہ ہڑ بڑا کر.. لڑکھڑا کر پھر سے کھڑا ہو جاتا..

تہہ خانے کی چھت کے شگاف میں سے جو ستارے دکھائی دے رہے تھے، جانی کے دونوں بازوں کی جانب اٹھے ہوئے تھے اور ان میں ایک کلاشکوف جکڑی ہوئی تھی.. وہ چاہتا بھی تو اپنے بازو نیچے نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اتنا اکڑ چکا تھا اور چاہتا بھی تو اس کلاشکوف سے چھکارا حاصل نہیں کر سکتا تھا.. اس کے لوہے پر اسکی انگلیاں پکھل کر منجد ہو چکی تھیں..

اسے اگر اسی حالت میں اٹھا کر کسی کلینیک میں لے جایا جاتا تو وہ مکنیکی طور پر مر چکا تھا کہ اس میں کچھ بھی نہ دھڑ کتا تھا... کچھ روائی نہ تھا، کچھ بہاؤ میں نہ تھا..

صرف اس کی آنکھیں بقیہ بدن سے الگ ہو کر زندہ تھیں اور دیکھتی تھیں اور ان کی پُتلیوں میں ابھی تک ایک پرنده تیرتا تھا..

تہہ خانہ.. سیڑھیاں.. قلعہ جنگلی کا کچپا صحن سب خاموشی میں تھے..
راکٹ فائر کرنے والے سائے مطمئن ہو کر کب کے جا چکے تھے..
رات تھی..

ایک ایسی رات کتنی طویل ہو سکتی ہے جس میں ایک بدن ہنینکی طور پر
مرچکا ہوا اور صرف اس کی آنکھیں شگاف میں دکتے چند ستاروں کو دیکھتی ہوں..
اسے اپنے ساتھیوں کے بکھر جانے کا، مر جانے کا چند اس قلق نہ تھا..
کوئی دکھنہ تھا کہ اس کا پورا بدن حیات سے عاری ہو کر مردہ ہو چکا تھا۔

تہہ خانے میں یہ رات اتنی ہی طویل تھی جتنی کہ ایک ہنینکی طور پر مردہ
بدن محسوس کر سکتا ہے... یعنی کوئی بھی زندہ شخص چاہے وہ کینسر کے آخری
مراحل میں اذیت سے ترپتا ہو، یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ رات کتنی طویل تھی..
گھوڑے کی تھوڑتی بہت الفت سے اس کی دامیں نانگ سے نکراتی تھی..
پانی.. ایک ہنینکی طور پر مرے ہوئے شخص کے بدن کے لیے بھی بہت
سرد تھے..

دھواں تخلیل ہو چکا تھا.. پانیوں کی اتھل پتھل ختم ہو چکی تھی اور اوپر
ستارنے تھے جو شگاف کو پر کرتے تھے..
تصور کامل ہمیشہ ہار جاتا ہے..
ہاں ڈیڈی..

اور تم ہارنے کے لیے وہاں جانا چاہتے ہو؟
ہاں ڈیڈی..

آتش پرست کے سامنے مرتبان میں جلتی مقدس آگ کا شعلہ تیز ہوا سے

بری طرح پھر پھر لایا... یہ شعلہ بھی ایک زمانے میں ایک تصور کامل تھا جو اب متذوک ہو چکا تھا.. پیشتر خداوں کی مانند... بامیان کے بدھ کی مانند... یہ رات اس آتش پرست بوڑھے کے لیے بھی بے حد طویل ہو رہی تھی جس نے اپنے شعلے کو زندہ رکھنے کی خاطر لاکھوں راتیں گزار دی تھیں.. کیا ایک ہزار برس بعد قلعہ جنگلی کے اس تک زمین میں دفن ہو چکے تھے خانے کے اندر جو ہڈیاں ہوں گی، ان کی بازیابی کے لیے بھی کسی کو خواب آئے گا کہ ہم یہاں دفن ہیں اور وہ ہمیں کھود نکالے گا اور اس تھے خانے کے عین اوپر ایک اور مزار شریف وجود میں آئے گا... یا تک تک یہ جو کچھ ہے، یہ بھی متذوک ہو چکا ہو گا..

رات ازل سے شروع ہوئی تھی اور جانے کب اس کا ابد آنا تھا، یہ اتنی طویل ہو رہی تھی..

نیلگوں شیشہ پانیوں میں.. جھیل بند امیر کے پانیوں میں وہ سب کے سب من چلی کھلنڈری غل مچاتی ڈولفونوں کی مانند تیرتے پھرتے تھے.. ان کے بدن نئے نکور تھے.. پھوٹی کونپلوں کی طرح.. شفاف تھے، شرمیلی کنواریوں کی طرح اور بے داغ تھے نیبوں کے لبادوں کی طرح ان پر کوئی زخم نہ تھا.. کوئی ناسور، کوئی گھاؤنہ تھا، وہ ابھی ابھی ماں کی کوکھ میں سے نکلتے تھے اور تیرتے پھرتے تھے.. اپنے صحراءوں اور اپنی کربلاوں کی پیاس بجھاتا عبد الوہاب تھا۔ جھیل میں بار بار ڈیکیاں لگاتا، اس کے پانیوں کو اپنے سوکھے حلق میں اتارتا، بارش میں نہاتے بچے کی مانند سور چھاتا عبد الوہاب تھا تیرتا پھرتا..

کنویں کی تھے سے برآمد ہونے والے بونے کو دیکھ کر خوشی سے "ہو ہو" کرتا اللہ بخش تھا اور وہ تیرا کی نہیں جانتا تھا.. جو ہڑوں میں پلنے والا اتنی شیشہ جھیل کے پانیوں میں ڈیکیاں کھاتا ہا تھے پاؤں مارتا اللہ بخش تھا..

چی پچی اپنے گاؤں کے چوہاں میں سے اٹھنے والے دھوئیں کے عقب
میں ایک چٹان کے جھرنوں میں تیرتے عقاب کی مانند اس جھیل میں پھر پھر آتا اور
خوشی سے لبریز ہوتا تھا..

گل شیر ولی زندگی میں پہلی بار آزاد ہوا تھا.. اس کی پشت پر کوئی نواب
سوار نہیں تھا اور اسے ایک گھوڑے کی مانند نہیں ہانتا تھا اور نیلو نیل شفاف پانیوں
میں تیرتے ہوئے اس کے آس پاس مالٹوں کے باغ مہک دیتے تھے۔

ہاشم میر کے لیے اس کی ماں گرم دودھ کا گلاس لے کر آئی تھی اور وہ
پانیوں میں چھینٹے اڑاتا سے کہتا کہ .. بس تھوڑی دیر اور می .. بس تھوڑی دیر ..
جھیل بند امیر کے پانیوں میں مرضی بیگ کے باپ کے گناہ دھل رہے
تھے ..

پھر اس نے اپنے آپ کو دیکھا..

ایک تکنیکی طور پر مرے ہوئے جان واکرنے اپنے آپ کو دیکھا..
وہ کیسے ان میں ہو سکتا تھا کہ وہ تو وہاں جا چکے تھے اور وہ شائد بھی تک
بیہاں تھا.. لیکن اس نے اپنے آپ کو اپنی نظروں سے دیکھا کہ وہ بھی جھیل
بند امیر کے پانیوں پر اپنے براؤنی پر سوار چلا جاتا ہے .. براؤنی کے پاؤں پانیوں میں
نہیں ڈوبتے، ڈوبنے سے پہلے ہی اٹھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ وہ اتنا برق رفتار
ہے ..

ایک فرق تھا..

اس کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی اس کی جانب دھیان نہیں کرتا
تھا۔ اگر کرتا تھا تو اسے نہیں دیکھتا تھا..

وہ آپس میں چھلیں کرتے تھے لیکن اس کے وجود سے بے خبر تھے ..
گھوڑا مجتمع ہو چکا تھا.. اس کی پسلیوں کے گوشت میں سے جتنے پارچے

تراش کر نگلے گئے تھے، وہ سب کے سب اپنی جگہ پر موجود اس کے بدن کو مکمل کرتے تھے.. اس کی تھوڑتھوڑی پھر سے چڑھتی تھی اور اس کے نیچے پھرستے اور ہنہناتے تھے.. جانی نے محسوس کیا کہ اس کے آس پاس صرف اس کے نہموں کی آواز نہیں جو پانی پر چھینٹے اڑاتے جاتے تھے بلکہ ایک پھر پھر اہم بھی تھی جیسے ایک پرندے کے پروں میں سے دوران پرواز سنائی دیتی ہے.. اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں جو پرندہ تھا، شاندودہ باہر آگیا تھا.. اس نے اپنے پر.. سفید براق پر.. گھوڑے کو عطا کر دیئے تھے اور وہ جھیل کے پانیوں سے اٹھ کر ان سفید براق پروں کو پھر پھر اتا عرشوں کی جانب پرواز کر رہا تھا..

گھوڑے کی تھوڑتھوڑی اب بھی اس کی دامیں ناگ کو چھوتی تھہ خانے کے پانیوں میں بچکو لے کھاتی تھی..
یہ تھوڑتھوڑی اب بھی عرشوں کی مسافر تھی.. اور ابھی تھہ خانے کے پانیوں میں ڈیکیاں کھاتی تھی..

رات ختم ہونے میں نہ آتی تھی..

کسی بھی شے یا جذبے کی مدت کا تعین آغاز اور انجام کے درمیان پھیلے فاصلوں سے ہوتا ہے.. اور یہ تعین حیات پر منحصر ہوتا ہے.. اگر کوئی جس نہ ہو، بدن مردہ ہو چکا ہو تو پھر یہ تعین ایک موت کی مانند ہوتا ہے جس کے فاصلے روز حشر تک جاتے ہیں۔

اسی طور اس رات کے خاتمے کا تعین نہیں ہو سکتا تھا۔
یہ ایک ایسی، ہی لاحدہ درات تھی۔

لیکن صرف جانی کے بدن کے لیے..

قدرت کا نظام قلعہ جنگی کے تھہ خانے میں تکنیکی طور پر مردہ ہو چکے ایک شخص کے لیے تو نہیں رکتا۔ بے شک اس کے آس پاس کچھ ساتھیوں کی

لاشیں ہوں.. کچھ پانیوں میں تخلیل ہو چکے ہوں اور گھوڑے کی ایک تھوٹھنی ہو جو
ابھی تک اپنے گمان میں عرش پر تھی.. یہ نظام تو نہیں رکتا، جاری رہتا ہے۔ اسی
لیے تہہ خانے کی چھت کے شگاف میں سے دکھائی دینے والے ٹمثماتے ستاروں
کی لومدھم ہونے لگی.. وہ معدوم ہونے لگے.. روشنی کے آگے ہتھیار ڈال کر پسا
ہونے لگے اور پھر معدوم ہو گئے..

ایک ہلکی روشنی.. ایک دھنڈی سوری کی روشنی آسمان کے اس نکڑے میں
سے در آئی.. جو تہہ خانے کے واحد مکین کو دکھائی دے رہا تھا اور پھریوں لگا جیسے وہ
روشنی اپنے آسمان کو ترک کر کے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر سے اترتی ہے.. اس
شگاف کے راستے داخل ہوتی ہے اور پھر ہر سوچ کا چوند ہو گئی..

آتشیں وجود کی غیر موجودگی میں بھی ہر سور و شنی ہو گئی۔

اور آغاز میں ہر سوپانیوں پر دھنڈتیرتی تھی
اور تب خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا..

تو ہر سور و شنی ہو گئی..

اوپر قلعہ جنگی کے صحن میں کچھ چہل پہل تھی..

کبھی کبھی کوئی چہرہ جھک کر اس شگاف میں سے نیچے جھانکتا اور ناک پر
رماد رکھ کر پرے ہو جاتا..

ریڈ کراس کے کارکن لاشیں اٹھا رہے تھے..

شگاف میں سے دکھائی دینے والے آسمان کے نکڑے میں قلعے کے صحن
میں سے لاشیں گھسیٹنے اور جمع کرنے سے کچھ دھول اٹھ رہی تھی..

پھر یکدم اوپر چپ کا سناٹا اتر آیا..

دوپھر ڈھلنے لگی..

پھر کوئی ایک لمحہ ایک ساعت ایسی آئی جو درج تھی اور اس میں قلعہ جنگی

کے صحن میں جو شگاف تھا۔ اس میں سے کسی نے جھانکا اور کہا۔ ”نیچے تہہ خانے میں بھی کچھ لا شیں ہوں گی، انہیں اٹھانا چاہیے..“

”ادھر سے سیرھیاں اترتی ہیں.. چلو“ کسی اور نے کہا۔

قدموں کی دستک اس مکینکی طور پر مردہ بدن کے کانوں میں آئی۔

پہلی سیرھی پر کچھ پاؤں آئے.. ان میں کچھ فوجی بوٹ تھے، کچھ جاگرز اور کچھ چپلیں..

وہ بے خطر نیچے اترتے تھے۔ جب عبدالحمید جان واکر کے مرچکے منجد بدن کی آنکھوں کے علاوہ وہ ایک انگلی بھی زندہ ہو گئی جو لبلی پر تھی، اسے دبانے میں پھر وہ لگ گئے، بالآخر وہ دب گئی..

گولیوں کی باڑ نے سیرھیوں کا پلستر ادھیر دیا اور ان میں سے دھوں بلند ہوئی اور اس دھوں میں کوئی زخمی ہو کر گرا اور لڑھلتا ہوا نیچے پانی میں آگرا۔

”شٹ...“ کسی نے امریکی لجھے میں تھوکا۔ ”ادھر توب بھی کوئی ہے..“

”ہاں... میں ہوں... ڈونٹ کم ڈاؤن آر آئی ول شوت...“

”کراست...“ اسی لجھے میں ایک بے یقین حیرت کا خوف انہر۔ ”یہ تو ہو نہیں سکتا لیکن نیچے.... ہم میں سے کوئی ہے۔“

”نو.... آئی ایمناٹ وان آف یو... میں تم میں سے نہیں ہوں۔“

اور اسی ساعت میں جب اس نے یہ کہا کہ میں تم میں سے نہیں ہوں، عبدالحمید جان واکر کی انگلی پھر سے مردہ ہو گئی... اس کی آنکھیں بھی مردہ ہو گئیں لیکن انہوں نے بینائی کھو دینے سے قبل شگاف میں سے نظر آتے آسمان پر ایک پرندہ تیرتے دیکھا اور پھر وہ گرا اور اسی پانی میں ڈوبنے لگا جس میں اس کے ساتھیوں کے لائے اور غلاظت اور بارود کی بو تیرتی تھی... ڈوبتے ہوئے اس نے گھوڑے کی تھوڑتھی کو ایک تھکلی دینے کی سعی کی.... براؤنی!